

تنہا تنہا

احمد سدرار



ترتیب

9	م
14	نیری اچھی سی سائے لائے
16	جین کے دم سے تھیں ہنسیوں نہا
18	پکوانے پر سے لڑے ہائے شہر میں
20	دست جب طبع سے ملے دشمن ہیں ہمارے
22	ہر ایک دل کو صبح پر نظر سہی ہے
23	ہر جہاں میں کی علی وہی ہے
24	ہاتھ کے نام
27	نہر
29	نہر گھونٹے شب تنہا بھی
32	کیا رشتہ یا کی گھوٹی جی
33	سیا
35	نظری
37	اگر کسی سے واسطہ نہ ملے
38	کس کو کہیں ہے بکرم سے راجہ تم بھی ہے

- 40 رات کو چلتے ہم، روتے کے داوی روتے
- 41 آن کے وہاں پہنچے، آگ لگی اور روتے ہیں
- 42 لپٹ لپٹ
- 43 تم زندہ آئے تم سے زندہ آئے
- 47 ہم لگی اور دشمن ہیں لے چکے
- 49 نکلتے تھپ تھپ، ہم لگی اور دشمن ہیں
- 50 وہاں وہاں، وہاں وہاں
- 51 انکار، انکار، انکار
- 53 لپٹ لپٹ
- 54 ہم لپٹ لپٹ
- 56 لپٹ لپٹ، لپٹ لپٹ
- 60 قتلے کر رہے ہیں، لپٹ لپٹ
- 61 قتلے کر رہے ہیں، لپٹ لپٹ
- 62 کس کس، کس کس
- 63 ہم لپٹ لپٹ، ہم لپٹ لپٹ

- 65 کہیں ہے وہ مگر غمزدی دور ساز ہو
- 66 غمزدی
- 69 ایک شعر
- 71 دل کو کہا ہے ہوا کرہ یکم
- 74 غمزدی ہے
- 77 بس جی دل کوئی کے واسطے ہو گئے
- 79 اسی سے زود کیجیے دھرم
- 80 کچھ نہ کہی سے ہمیں گئے
- 82 سکوت میں گئے اگلے اوس میں پئے ہیں
- 83 صرف
- 86 سکوت
- 91 طبع سے حیرت انگیز
- 92 تیرے جیسے جیسے عقل میں جاتے ہیں پیرا
- 94 میری حالت ہے کہ اس میں وہ ہے کوئی
- 95 وہ ہے کہ ہے دل میں تیرے کے بول گئے

91	ملوئے نام نہاں ہے قریب آج
-	پیشیا
103	راہیں ہیں آوازیں دیا کوئے ہیں
104	سے اٹھ کر کوئی خیال نہیں
106	ہم ہیں ٹھکت ہیں کہ زجر الہیہ کو قریب ہے
108	دل کو اب چاہی تھی۔ "ایب" تھی ہے
110	ہم اس لئے آپ ہیں کہ گئے ہیں یہ کیر بھی
111	تھاوت
113	سب کچھ فراموش تھے ہیں سوسائٹ آئے ہیں
115	خسلس
118	کیر

شاعر

جس آگ سے ہی آج جل اُٹا ہے اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہوئی تھی
جس کرب کی شدت سے مری روح ہے بکلی
پہلے بھی مری زلیست کا آزار ہوئی تھی
جس سوچ سے نہیں آج لٹو کھٹوک رہا ہوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہوئی تھی

دو غم، غم دنیا جسے کہتا ہے زمانہ
 دو غم، بلے جس غم سے سرکار نہیں تھا
 دو درد کہ ہر دور کے انسان نے محسوس کیا
 دو درد مرے عشق کا معیار نہیں تھا
 دو زخم کہ ہر سینے کا ناسور بنا تھا
 دو زخم مجھے باعث آزار نہیں تھا

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو سمجھ لیا
 لیکن مرا احساس غم فداست میں گم تھا
 آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
 لیکن مراد دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
 تیس وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور
 جام دے دینا و خرابات میں گم تھا

دربار کی قسمت سیاح کا سامان تھا مرنے
 باغیچوں میں مرے غزلت گدا لب پہ غزلت
 شاہوں کی ہوا خواہی مرادوقی سخن صفا
 ایوانوں کی ترمیم و شست و دوش عمل متی
 اور اس کے عوض عمل و چراہر بجے ملے
 دارنہ مراد نعم نام فقط تیغ آہل متی

پھر میرے کہی میں نے لب ارغدار کے قفسے
 گاہے گل و بیل کی حکایت کو نکھارا
 گاہے کسی شہزادے کے افسانے سنائے
 گاہے کیا دنیا سے پرستان کا نظارہ
 میں کھویا رہا ہنر و ملائک کے جہاں میں
 ہر لحظہ اگرچہ بجے آدم نے چکھارا

برسوں کی نہیں دل جمعی اور رنگ کی خاطر
 تو پھول کھلائے کبھی تو زحمت غریبے
 میں لگتا رہا، جو بغاوت منشوں کی
 میں پڑھتا رہا قصہ نشینوں کے قصیدے
 ابھرا بھی اگر دل میں کوئی بندہ سرکش
 اس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ کھلے

لیکن یہ طلسمات بھی تا دیر نہ رہ پائے
 آفرے و مینا و دت و چنگ بھی ٹوٹے
 یوں دست و گریباں ہوئے انسان و خداوند
 نجیر تو تڑپے قفس رنگ بھی ٹوٹے
 اس کشمکشِ ذرہ و انجم کی فضا میں
 کنگول تو کیسا افسردہ و ادنگ بھی ٹوٹے

یہی ہے وہ مسرت کردہ اپنے محبوب آفاقی تعریفِ توصیف میں
آسمان وزمین کو طیش

کردہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کردہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قعیدہ فریادوں نے سوچا

کردہ تو ہیں حمد سے میں ایرانِ شاہی کے مبارک کیش سے بھی کمتر
انہیں کیا کوئی آئے یا کوئی بلے

کہ ان کا فریضہ تو ہے صرت آقا سے حاضر کی خدمت گزاری
کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر صحت ہے اسی میں

کہ اپنے قعیدوں سے آقا سے نوکاریں غیر مقدم -

طہارِ منزلی جہاں ہمیں ہی کرنا ہے
فرزِ تم ہی اگر قوی ہو سہ سہ



راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں
لے دل ترے وصلے بڑے ہیں

اے یادِ حبیب ساتھ دینا
کچھ مرسلے سخت آپڑے ہیں

رُکنا ہو اگر تو سو بہانے
جانا ہو تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں دُور گریہ
جب آپ بھی ساتھ روٹے ہیں

اب جانے کہاں نصیب نے جائے
گھر سے تو فتنہ اُڑ چل پڑے ہیں



لے اڑا پھر کوئی خیال ہیں
ساقیا ساقیا سنبھال ہیں

رو رہے ہیں کہ ایک حادثہ ہے
ورنہ آتش نہیں ٹال ہیں

خلوتی ہیں تہے جمال کے ہم
آئینے کی طرح سنبھال ہیں

مرگ انہوہ بیشادی ہے
مل گئے دوست صہب ٹال ہیں

اختلافِ جہاں کا رنج نہ محنت
دے گئے مات ہم خیال ہیں

کیا توقع کریں زمانے سے
ہو بھی مگر جبرِ سببِ ال ہیں

ہم بیاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن
اپنی محفل سے مست نکال ہیں

ہم ترے دوست ہیں منہ از مگر
اب نہ اور گنجینوں میں ڈال ہیں



ہم میں خلست میں کہ ابھرا نہیں غور شیداب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سناتا تھا حدیثِ عنہم دل یوں تو مگر
ہم نے پھیر لی ہے تہے نام سے تمید اب کے

پی گئے زندہ کرنا یاب ہے صہب اور نہ
زہر حق تعصبِ شہر کی تنقید اب کے

تنگی و بربتنوں ہے تو چلو یوں ہی سی
کوئی سنگ آئے ہر ساغر جمشید اب کے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یہاں نے بڑھ کر
 قاتل کو چکارا کبھی مقتول میں مسدا دی
 گھسے دن و در کے خوش میں بھولے
 گاسے دم و دیر کی بنیاد یاد دی
 جس آگ سے صبر پور تھا ماحول کا مینہ
 وہ آگ مرے رون وستم کو بھی پیدا دی

اور آج شکستہ ہوا ہر طوقِ طلائع
 اب فنِ مراد و بار کی حب آگیر نہیں ہے
 اب میرا جہنم ہے مرے جمہور کی دولت
 اب میرا جنوں خائفِ تصنیف نہیں ہے
 اب دل پر جو گزے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
 اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

حضور سکرا ہے میں میری بات بات پر
 حضور کو رہ جانے کیا گناہ ہے میری اس پر
 حضور منہ سے بڑی ہے پیک صاف کیجیے
 حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجیے
 حضور کیا کیا، میں آپ کو بہت عزیز ہوں
 حضور کا کہہ دو نہ میں بھی کوئی چیز ہوں
 حضور چھوڑیے میں ہزار اور لوگ ہیں
 حضور جانیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں



تیرے ہی باتیں ہی سنا سہ آسے
دوست بھی دل ہی دکھائے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چُپ کی گلی ہے جیسے
ہم تجھے سال سنانے لے

حق تھا ہے میرا منزلِ منہ
کون یہ جو مجھ اٹھانے آئے

ابھی دوست ہیں دیکھ، کہ ہم
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

دل دھڑکتا ہے غم کے ہنگام
ہاشش پھر کوئی دلائے آئے

اب تو رونے سے بھی دل دھڑکتا ہے
شاید اب ہر شے ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُٹھیں
لوگ کیوں جین مٹانے آئے

سور ہو موت کے پہلو میں فراز
خیزد کس دقت نہ جانے آئے



جن کے دم سے تیں بیتیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم بھرا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا میکسنوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشہ دل میں
ایک ڈتیاے سیکراں آباد

چند منطفہ اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جیلا کر نہ رو محبت میں
یہ تو ہوتا ہے خانہاں آباد

کتنے تارے فراز ٹوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد



کچھ ایسے ہم نے خوابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کڑھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیں کی باتیں پر اسے شہروں میں

کچھ ایس طرح سے ہر آف بام و د کو دیکھتے ہیں
نہانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سنا ہے جب بھی ٹٹی ہے ہزار ویرانہ
تو چند اور چمن مسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ جو سے تلخ تجربے پھر بھی
ہیں ریات کے غم کھینچے لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جھل کی آگ سب سے یارو
محب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

قرار ہم وہ غزالہ دشت و محسراتیں
ایسے کر کے جنہیں لوگ لائے شہروں میں



دوست جب ٹھہرے چین کے دشمن جان بہا
زخم دکھلائیں کسے پیر سینہ چاکاں بہار

نثر اس اس خوش وقتی نے اندھا کر دیا
برق بھی چمک تو ہم بکے پسداخان بہار

خون رولواتے ہیں سب کو اپنے اپنے قبرے
وہ پشیمان خزاں ہوں یا پشیمان بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذور ہیں
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی سنہاں بہار

اسے خوشامدِ قضاں جب غمِ پیرائی تو ملتی
اب تو شرمِ درِ مظلومیں خوشنویاں بہار

گر تو نہی بادِ صبا اٹھکیلیاں کتنی پھری
شعلہٴ گل سے بھڑک اٹھے گاداں بہار

کب مجھے دل تنگ ہم زنداں میں دیکھی فراز
ہاں مگر جب آگئی ہے یادِ یارِ بہار

ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے
 کہ شہر عشق میں جلوں کی قطار کی ہے
 کہاں ہے دوست کہ آشوبِ ہرے میں ہے
 ترے خیال کی آسودگی بپا کی ہے
 بتا رہا ہے غصہ کا اثر سنا
 افق سے پھر کوئی آندھی اترنے والی ہے
 رز ہے ہی تگوتے چمن میں کھلتے ہوئے
 خستہ دستِ جہاں میں لہو کی لالی ہے
 ہیو شراب کو ناصح نے زہر بھی دے کر
 ہماری مجرأستِ دندانہ آزمائی ہے
 پھر آج دانہ گندم کے سلسلے میں سنہرا
 کسی خدائے مری غلہ بیج ڈالی ہے



ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے
کیا باد مراد چل رہی ہے
ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دنیا ہے کہ چال چل رہی ہے
یوں دل میں ہے تیری یاد جیسے
ویرانے میں آگ جل رہی ہے
نہل پھیر رہا ہے بربے تو نے
دنیا کی فتنہ بدل رہی ہے
درمیشی ہے آج بھی وہ صورت
جو صورت حال کل رہی ہے
اتنی بھی سنہرا زبد دل کیب
سنبھلوا کہ فضا بدل رہی ہے

بانو کے نام

ملو کیت کے محل کی گستاہنگار کینز
 وہ مجرم کیا تھا کہ تجھ کو سزا دے مرگ ملی
 وہ راز کیا تھا کہ تعزیر تارو اس کے غلات
 تری نگاہ نہ محبت کی تری زباں نہ دلی
 وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
 ہر ایک جبر کو تو سہ گئی بطیب دلی

• وہ کم سن کینز جو تارو سے متعلق کر دیا۔

یہی سنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
 کہ ڈنڈے قصر کے کچھ تیغ بید جاگتے تھے
 تری نظر نے وہ غولت کدوں کے ڈانچ گئے
 جو خواجگی نے ذر و کسم میں چھپانے تھے
 تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا
 ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ کسم ہمارہ نہیں ہے اگر تری لغزش
 مزاج قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
 ہمیشہ اُدھے محلات کے بھرم کے لیے
 ہر ایک دور میں تزیینی طوق و دار ہوئی
 کبھی چٹنی گئی دلوایہ میں انار کلی
 کبھی شکستہ پتھر اڈکا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سطاس یہ بیگیاست یہ قصر
 موزنین کی نظروں میں بے گناہ رہے
 یہ فیض وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا
 زمانے والے طرفندار بکھڑے رہے
 ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
 جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

مجموعہ

اسے یہ فتنہ مہینہ تراہیں پھر
 کتنی پھرانی بھائی آنکھوں میں فلیٹ ہے
 جانے کس دورِ ہلاک سے لے کر ایک
 تو کسے وقت کے زندہ نویں غم ابیدہ ہے

تیرے شہر گھس بھلے کے یہ بے جان نقوش
 جیسے مرثیہ خیالات کے تانے بانے
 یہ تری سانوی بخت یہ پریشان مغلط
 بارہا جیسے مٹیا ہو، نہیں دنیا سے

ریشہ سنگ سے کھینچی ہوئی زنجیر میرے
 راستے سینہ کسار پہ پل کھاتے ہیں
 اردوؤں کی جھکی محرابوں میں جلد لگیں
 جس طرح تیر کافروں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ ستاروں کا سنگین ظلم
 جیسے آیا بخرانوں پہ کٹے پھٹے ہیں
 تندہذبات سے بھر پور برہنہ سینہ
 جیسے کستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
 رگینہ اراہن جیش کی کشتی سنا دی کو
 تشنہ روجوں کے ہر شاہک تفتیش کے لیے
 جھلڑ سنگ میں پاسبند بنا رکھا ہو



نہ گیسوئے شب آسماں
نہ غل جیسے تو پر خواب کہاں

جی ملاتے ہیں کو کے عروسے
لو گیسو چشمہ مت بے باں

شہر خسان سب صحوالی طسوی
بدرہ نگار جہاں کہاں

سلیح دین تو سبے ہموار
بیتیاں جو نہیں غائب کہاں

تختی سم ہے بوں کے مس تک
کوئی پل جائے تو زہر اب کہاں

عشق ایک کوہِ گراں تھا پہلے
اب محنت کے وہ آداب کہاں

اب کہاں لہلہ وفا سٹتے ہیں
پہلے ہم لوگ تھے نایاب کہاں

اب تو دھڑکن سے بھی جی دگتا ہے
اب یہ دل پارہِ سیلاب کہاں

ق
ہم بھی کھتے تھے چراغانِ بہار
لیکن اب آنکھوں میں غائب کہاں

ہم کو بھی لذتِ غم تھی پیاری
لیکن اب جی میں تب بے تاب کہاں

اب بھی پایاب نہیں رہے مجھ میں
پھر مری اندیشہٴ سیلاب کہاں

کیا رخصتِ یار کی گھنٹی مٹی
 ہنستی ہوئی مات رو پڑی مٹی
 ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
 دنیا کو ہمساری کیا پڑی مٹی
 یہ زحمت ہیں اُن نون کی یادیں
 جب آپ سے دوستی بڑی مٹی
 جاتے تو کہہ کر کو تیرے وطنی
 زنجیر جنوں کڑی پڑی مٹی
 درِ یوزہ گر حیات بن کر
 دنیا تری راہ میں کھنڈی مٹی
 غم آتے کہ سنہ از آندھیاں تھیں
 دل تھا کہ سنہ از پیکھڑی مٹی

سیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو
تو مری تیغیوں کا بسبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دساز ہیں
تیس کہی اجنبی لگیں اسبب تو نہیں
تجھ کو میری مسرت مستدم سہی
تیرا غم مجھ کو دیر طربب تو نہیں

تیرا احسان ہے تو نے میرے لیے
 اپنی چٹکوں سے راہوں کے کانٹے پھٹنے
 عود کڑی دھوپ میں رو کے میرے لیے
 تو نے زلفوں کے شاداب سائے بننے
 میری حسرتِ زمانے کو پاگل کسا
 میری حسرتِ زمانے کے طعنے سُنے

تو مری زندگی ہے مگر حسانِ من!
 اب وہ حشر و محنت کی رسمیں نہیں
 میرے دل میں کئی گھساؤ ایسے بھی ہیں
 جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
 ایک غم جس کی شدتِ بزمِ گیر ہے
 تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہ نکلا کساروں سے
 دیکھو نازک نازک کریمیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر
 دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
 دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے جھیلوں پر

تم بھی تند تند سپنوں کی لہروں پر بہ جاؤ
 اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
 اور ذرا جاؤ

سنا سنا موسم ہے شعلوں کی دہکتی ہمت سے
 پٹختے سولج کے سستے میں ہماری دنیا جلتی ہے
 دھک دھک اٹھی ہیں سرکھیں تپتی دھوپ کی شہت سے
 ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لڑ جلتی ہے

بس کوئی ایک برہنہ شیت بھجوا دو سہ جاؤ
 اور ذرا کچھ لے لے مشرود
 اور ذرا رنہ جاؤ

دیکھو چار طرف ٹنڈے ٹنڈے سداے لڑائی میں
 آج کے کھوے ہوئی بکھرے شام کا ہار و قائم ہے
 نکل نکال لیں کے جو گے ٹھنڈی برساتی
 ٹپکت ہے تم کو جانا ہے پر یہ بھی کیا لازم ہے

مشرود کچھ باتیں ہم سے سن لو کچھ تم کو کرب و
 اور ذرا کچھ لے لے مشرود
 اور ذرا رنہ جاؤ



اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
تو بے فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں

بہیں ستم کا گلو کیا، کہ یہ جہاں واسے
کبھی کبھی ترا دل بھی دکھانے لگتے ہیں

بیٹھے چوڑے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

چمک چمکتے ہی دنیا اُجڑ رہی ہے
دوستیاں جنہیں بے زمانے لگتے ہیں

فرار لگتے ہیں غم بھی نصیب و اوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں



کس کو گناں ہے اب کہ مرے ساتھ تم ہی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم ہی تھے

یادش بغیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اک دور تھا مجب کہ مرے ساتھ تم ہی تھے

بے مہرئی حیات کی شدت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم ہی تھے

میں اور نقابِ عسیم دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم ہی تھے

اک خواب ہو گئی ہے وہ در سبم دوستی
 اک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
 وہ بزم دوست یاد تو ہو گی تھیں منہ راز
 وہ محفل طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے



رات کے پچھلے پر روستہ کے عادی تھے
آپ آئے ہی مگر روستہ کے عادی روستہ
نہ سے تارے سے چو غمستہ تھے تو
نہ کے ہاتھ ہی مگر روستہ کے عادی روستہ
اسے پاندی آدب ترن محسن کی
کر روستہ کے عادی روستہ
ایک تقریب بمشتمل بریں یگیں
چرمی نگہیں ٹوئیں روستہ کے عادی روستہ
رواندوں کو کہیں ہی مستہ روستہ
کوئی صحر ہو کر روستہ کے عادی روستہ
اسے دے ایسے میں برسات کے ٹی سوں
گریہ شام و مکر روستہ کے عادی روستہ



اُن کے دھڑوں یہ یقین ٹوٹ بھی دیوے میں
اب لعلیں تو ہیں ٹوٹ بھی دیوے میں
میری وحشت ہی کسسی موردِ وار ہو کر
اسے مری رہ رہیں ٹوٹ بھی دیوے میں
گر دستیں جامِ کھن کر دستیں یہ نہ کھن
یہ خواہستِ فتنہ ٹوٹ بھی دیوے میں
تپ تو حاصل ایسا بن دلا دیں صبر
آپ درخشیں دس ٹوٹ بھی دیوے میں
اک ملاقات سر رہ بھی سن جیسے مگر
جو کہیں تب کہیں ٹوٹ بھی دیوے میں
ور دمندِ محبت نام نہ دمنہ نہ
ور نہ کچھ کچھ یہ جس ٹوٹ بھی دیوے میں

ایبٹ آباد

ابھی تک ہے نظریں وہ شہر سبز و گل
جہاں گشتائیں سب پر گزار جھومتی ہیں
جہاں ستارے اترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پھاڑوں کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنار و سہرہ کی پرچائیوں میں جھومتی ہیں

ابھی تک ہیں نظر کے نگار غلے میں
 وہ برگ گل سے تراشے ہوئے بہشت سے جہم
 وہ بولتے ہوئے افسانے الٹ پلٹ کے
 وہ رنگ و نور کے پکیر وہ زندگی کے ظلم
 اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں کی جہی کے لیے
 خیال و فنکار کی دنیا میں کوئی نام نہ ایم

ابھی تک ہیں تصور میں وہ در و دیوار
 بیسٹ دامین کسار میں چناروں تلے
 جہاں کسی کی جواں زلف بار بار بکری
 جہاں دھڑکتے ہوئے دل جھپٹوں میں ٹپٹے
 عجیب تھی وہ محبت و کول کی نیم تاریکی
 جہاں نظر سے نظربان چہ رخ بٹے

میں لوٹ آیا ہوں اس شہرِ سبزہ و گل سے
 مگر حیات انہیں سامعوں پر مرتی ہے
 بجے یقیں ہے گئے بادلوں کے سائے میں
 وہ زلفت اب بھی مری یاد میں پکھرتی ہے
 چراغِ تجھ میں چمکے ہیں مگر پس چمکیں
 وہ آنکھ اب بھی مرا منتظر کرتی ہے



تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جان میں
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آنند صیاں نہیں کہ سوچ بھر گئے
ہائے و خمیں کہ جھوٹوں سے بھی نہیں نا آشنا

مذمتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تک
لوگ ناواقف ، فضا بیگانہ ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کویتے ہیں پیدا آتش۔

خلقِ شبنم کے لیے وہی کشتِ صحراؤں میں
کیا خیرا بر کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم نیکی فرز
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا



ہم بھی خود دشمن جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے مہا
پھول ہی پھول جاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ محبوبِ رواں تھے پہلے

کچھ شہر بنی کہیں اب دوا نہیں
روقی بزمِ معناس تھے پہلے

ہم کہ ہیں آئی غبارِ سپسِ زد
منزلِ ہم سفران تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا نیاں
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تو سے ہم شکوہ گناں تھے پہلے

بن گیا قاسدِ پلنے پلنے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

دلتِ غم تو میرے تھی سنہ از
اتنے منہاس بھی کہاں تھے پہلے



سکوتِ شب ہی سستم ہو تو ہم اُٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو پٹے لگیں ہوائیں بھی
یہ شہزیرے بے اجنبی نہ صحت لیکن
تھامے ساتھ بدلتی گئیں فضا میں بھی
جو ہزم دوست سے اُٹھ کر چلے بزمِ قسم
کوئی پکارے تو شاید وہ ٹوٹ آئیں بھی
دلوں کا قرب کیسے حاصلوں سے مشابہ
یہ خود فریب تراشہ چھوڑ جائیں بھی
ہم ایسے لوگ جو اُٹھ پڑیں بھی ہیں بخش
محب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی
مگر گریہ ستاروں کا نور بجھنے لگا !
فرار اُٹھو اب اس کی گل سے جائیں بھی



وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
دلِ جن سے مآپ کا ٹوٹے

جو حستم کش کشِ نمانہ
یا دایم خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پر میتیں کر رہیں
وہ دل جو مستِ لبر بار ٹوٹے

کھائیں گے فریبِ جمِ خوشی سے
پر یوں کہ نہ احتسابِ بار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فرازِ دوفوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے



انکار نہ استعار بڑی دیر سے چُپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چُپ ہیں

آسانی نہ کر دی ہو کیس موت نے مصل
روستے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

ساقی یہ نحوشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی تو سے میخوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

یہ ہرن نشیمن پہ گڑی تھی کہ قفس پر

مرزا بن گڑستا، بڑی دیر سے چپ ہیں

ہاں شہری ہر جہاں ہی یہ غیب کنساں

بازار کے بازار بڑی دیر سے چپ ہیں

خریدار

دل بے تاب کی موہوم سی نیکیں کے لیے
 ایک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
 آج کی رات بھی ٹراپنے درتپے کی طرف
 حسبِ معمول نئی شاہی سے استادو ہے
 تیرے ہمیں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا
 دیدنی ہے تیرے جلووں کی نمائش لیکن
 اب یہ عالم ہے کہ احساں تمیدتی سے
 تیرے زینے کی طرف تیرے درتپے کی طرف
 پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اٹھ سکتیں !

خیر مت

قصیدہ فریبوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ راحتِ جانِ تباہی ہے
جب اُن سے کوئی اُن کا آقا جُدا ہو رہا ہے
وہ آقا؟

کہ جس کی مسلسل کرم گسٹری سے
کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنیٰ غلام
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں سے
حاکم کے مفرد حقے بٹلئے

اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کوہِ بویس جسے نہیں گھومتا تھا
 مگر پھر بھی ہر سمت اسی داماں تھا
 اگرچہ جانگیر کی طرح اُس نے
 کوئی ایسی زنجیر زرِ قصر شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
 جس کی جگہ کسی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اُٹھاتی
 مگر پھر بھی ہر گھر میں عدل و مساوات کا سانباں تھا
 اگرچہ کبھی وہ بھر دے میں بیٹھے
 معایا کوڑھنے مبارک کے ددنی سے مجبور بہانہ کرتا
 مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ مکران تھا
 وہ جانِ جہاں تھا بڑا صراں تھا
 قصیدہ نویسوں نے سوچا
 کہ آخر وہ کھات بھی آگئے ہیں
 جب اُن سے پھر نے کہ ہے اُنی کا دیرینہ آقا
 تو وہ آج اُسے کون سا ایسا یابِ تمھ کریں پیش
 جس سے رہیں آجہاں آقا سائے عالی کو

اپنے دلاور و پاؤں شش برادر خادم
 قلعہ و قویوں نے سوچا
 کرو ہیں تو عہد سے ہیں
 نصرتی کے مژدہ بکس سے جی کھتر
 مگر عام ملک و قریاس کے ماتاہ ہیں
 وہ چاہیں تو اپنے ظلم کے اشارے سے
 ذروں کو ہم رتبہ ہر دستاب کردیں
 وہ چاہیں تو اپنے تخیل کے باد سے
 صحروں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں
 وہ چاہیں تو اپنے کماں ماں سے
 فقیروں کو درنگ و افسر کا ملک بنا دیں
 وہ چاہیں تو اپنے فسون زباں سے
 محلات کے بام و دیوار ڈھا دیں
 وہ چاہیں تو کیر نظام زمانہ بدل دیں
 کہ وہ عام ملک و قریاس کے ماتاہ ہیں

اے بھوکِ مخلوق

(۱۳۔ اگست ۱۹۵۷ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جھلک جھلک کرتی ہے شہر پہ
پھر بھی تیری رُوح عجیبی ہے اور تھک چکی ہے

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کڑکوں
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیسے سینے پر ہے غیروں کی بند وق
اے بھوکِ مخلوق

میں نہ سونہ ہزار نہ لاکھ ہیں چوسے آکر روڑ
 اتنے انسانوں پر لیکن چند انسان کا زور
 مزدور و درکار کے حق پر جھپٹیں گئے چور
 کھیت تو سونا اٹھیں پھر بھی ہے نامیدانا
 تیرے دیں میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج
 گداہوں کے پیٹ بچے ہیں راجل ہی صنم
 اسے بھوکا مسنون

آج گرفتار ہو گیا ہے تو بھی جہانست
 آند گزنا یا سب ہیں اپنے لٹو کے ویسے جلا
 پیٹ پر پتھر باندھ کے ایشب نکالنا رکھا
 آج تو بھنی خوشی کا دن ہے آج یکساں ہوگ
 تیری بہدیں دیکھنے آئیں نور نور کے لوگ
 تیرے غزانے پل پل تو میں کتنے ہی مسنون
 اسے بھوکا مسنون

قفلے گزرے ہیں۔ بھیس۔ بیہوش
 دائم آباد رہے شہر ترا
 دل ہے یہ شہر نموشاں کوئی
 نہ کوئی چاہے نہ دھڑکن نہ صدا
 آخر عشق کی رسوائی ہے
 اب بوجا سپہ پا تو گھر گھر ہو گا
 تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
 تجھ سے سننے کا سبب کیا ہو گا
 دہم تھا قافلہ ہم سفر
 منزل کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا
 شب تیرہ ہی قیمت تھی سفر از
 چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا



قاتل کے قہقہے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی گل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی بھی باتیں ہیں

تنگ جہانے کچھ کلمے 'زیریں کرے
اُس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہید سستی پر میں شرمندہ ہوں
تیرے بھوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

مقتل کے اندھوں کی محفل میں چپکے قرار
کتنی سیانی اس پاگل کی باتیں ہیں



کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلقِ شبنم کو ترستی ہے یہاں

سُرت اندیشہ افسی ہی نہیں
پہلوں کی شاخ بھی دوستی ہے یہاں

نُسخ کہ حر مژگیسا ہے دیا
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ درگزر نہیں اپنی غصہ
کس قدر مرد پرستی ہے یہاں

زینت وہ نہیں گراں ہے کہ فراز
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں



برہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کس کس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہر تہہ کن کن جہاد دیکھتے رہو

ہر فصل گئی ہے غیر یقینی سی این دنوں
مر مر چلے کہ بادِ صبا دیکھتے رہو

ٹھنکتے رہو کہ وقت نے بدلی ہے آگنی
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھاکل تو ایک نعرہ منصوبہ کیا

اور سب کو سیکڑوں میں خدا دیکھتے رہو

یارو پاک بچھکتے ہی تھے ہیں قافلے

یہاں خود کشی ہے نعرہ شش پا دیکھتے رہو

اجاب کھٹے دارورین تک پہنچ گئے

دیر تم فراز دست مبادیکھتے رہو



کشن ہے راگزر تھوڑی دُور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دُور ساتھ چلو
تمام ٹرکھاں کوئی ساتھ دیا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو
نشے میں چڑھ لیں گی تیس بھی ہش نہیں
بٹا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو
یہ ایک شب کی طاقت بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو
ابھی تو باگ ہے ہیں چراغ ماہوں کے
ابھی ہے دُور مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو
طوائف منزلِ جاناں ہیں بھی کرنا ہے
فراز قم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نہنتی

آدھ کئے باہوں پافشاں کے تارے لرزوں
 کھڑوتے گالوں پہ غلٹے کی تیس نہنتی ہیں
 سر د بے جان سے چہرے پہ تھرکتی انگلیں
 جیسے رگڑتے ہیں چرخوں کی نویں نہنتی ہیں

۶ سرور کے دور قلم کے جویا شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے وقت مولیٰ پر حوالہ
 کاروبار بنانے لگے تھے۔

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُتنگ
 کسی شوکھی ہوئی شہنی کا جھکاؤ بیٹ
 زد کھڑاتے ہوئے قدموں کی گراں رفا۔ ن
 خشک ہوتی ہوئی ندی کا ہساؤ بیٹ

رقص کرتی ہوئی پشوا ز پہ باہوں کی اُٹان
 باد بن جس طرز گرداب میں پکرتے ہیں
 یا کسی جھیل میں کلکے گرا دیئے سے
 چند لمحوں کے لیے دائرے بن جاتے ہیں

زرد آلود سے ماسقے پہ پسینے کی نمی
 ریگزاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو بیٹ
 جھینٹتے ہوئے ہر گام پہ پیسے گھنٹرو
 دُور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو بیٹ

زندگی باں نقاش، خاک بہ رُخ، تاد بلبل
 مجھ، ساکن و حیران ہیروے کی طسج
 چند تانبے کے تراشے بگے سکوں کے عوض
 ڈھول کی تھاپ پر رقصاں ہے بگولے کی طبع

ایک منظر

دُور کچھ ماتی نعروں سے غصہ گونج اُٹھی
 چند بھندوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
 (کچھ سیہ پوش تماشا کی باندازِ جلوں
 پاؤ پر تل سے سجائے ہوئے احلام لیے !
 دمدمِ نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف
 مینا پشیا بڑھتا ہی چپلا جاتا ہے

پُپ بیک کھلنے لگے بند دیر بچوں کے کور
 پٹنیں کانپتی یاہوں کے سہارے اٹھیں
 جیسے دم توڑتے بیمار کی جو محسوس چکیں
 اور کئی مضطرب بے تاب دسکتے چہرے
 ایک دلچسپ و اہم ناک تماشا کے لیے
 تنک و تاریک مہر و کون کے گھنے پردے
 نور کے چشموں کی مانند اہل آسمان ہیں



دل جو کتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذتِ غم بھی جب نشہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلہِ خوابِ طرب
سایہِ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے لباس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

گفتا و دکاش ہے جہاں گزراں
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و آنجبہ بھی تھے آباد کبھی
ان خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشہ گل میں بھی ہے موہ ترنوں
خمار کی نوک چھو کر دیکھو

اوس کی بوند بھی ہے شیش نگر
آنکھ آنکھوں سے بھگو کر دیکھو

ذرتے ذرتے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے ستاروں میں رو بات کمال
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگوں کے حسنہ اوندھی
ہتکشیں گل تو سنہرے کر دیکھو

جو دیے سے کے نکلتے ہیں فراز
وہ بھی کہا جاتے ہیں ٹھوکر دیکھو

منسوب ہے !

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کے سوپ دیا ہے تجھ کو
کس کے امن سے ہے باندھا گیا پتو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
 تیرے ہاں باپے کیوں نزع ترا بول دیا
 کالے بانار میں سیہم اٹھا کر تیرا
 سبز باغوں کے تصور پہ سبجے قل دیا

جو بھائی گئی فردوسِ فائنٹ کے لیے
 وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں
 یہ مکانات، یہ جند زید و کائنات، یہ زمیں
 میرے ابداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقت
 ایک دو گیت پریشان سے گلاستا ہوں
 گلاب گلاب کسی ناکام شہابی کی طرح
 ایک دوزخبر کے ساغر بھی چڑھایا ہوں

تو کہ ایک وادی گونگ کی شہزادی ہے
 دیکھ بیکار سے انساں کے لیے وقعت ہو
 تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی دلتی ہے
 ایک انجان سے طوفاں کے لیے وقعت ہو

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
 ورنہ اس رشتہ ہے ربط پر پچھتا سنے گی
 تو زین کہنہ رسومات کے بندہ من ڈرنہ
 بیستے ہی موت کے زنداں میں اُتر جائے گی



جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات پر محبہ بری دل
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سینے جھین طوفان نہ لے
تا خداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
اُن کے عارض بھی جگوتے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ بے بھی ہوں سنسراز
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے



اداس اور زیادہ کیس نہ ہو جائیں
فراز انجمن دوست سے چلو جائیں
نہ اجنبی، نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں
جو مدد ہم پر کرتے ہیں، تو گزیر جائیں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو ہمیں
اُبلکتے ہیں تم سے سو دانیوں سے اپنی خود
یہ سادہ لوح بھی پاگل کیس نہ ہو جائیں
نہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو ہمیں
شبِ فراق تو کشتیِ نعلین نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤں گے از سو جائیں



کچھ نہ بکسی سے بولیں گے
تنہائی میں رولیں گے

ہم بے راہ رو دوں کا ایب
ساتھ کیسی کے بولیں گے

خود تو ہٹے دُسو ایسکن
تیرے بھید نہ کھولیں گے

بیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے

بہر کی شب سونے واسے
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آنکھیں اُٹھے گی
پہنچی جب پر تو لیں گے

خینہ تو کیا آئے گی مسندِ
سوت آئی تو سولیں گے



ملکوت ہی کے جو فتنے دلوں میں پڑتے ہیں
وہ زخمیہ رگب جہاں توڑ کر چلتے ہیں
خسور آپ شب آریساں کریں لیکن
فقط نورد سرتک چراغ جلتے ہیں
اگر فضا ہے مخالفت تو زلف مسراؤ
کہ بادباں ہواؤں کا رخ بدلتے ہیں
کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کر رہیں بدلتے ہیں
یہ پاس پیر مٹاں ہے کہ ضعف تشنہ ہی
نشہ نہیں ہے مگر ٹکڑا کے چلتے ہیں
خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ مسراؤ
بصد وثوق دغاں کا دوبار چلتے ہیں

متران

ساتھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
 زبون خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
 کسی پتھر پر رگڑا پس کو کسوٹی پر پرکھ
 ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اک ٹکڑے سے دیکھ

مجھ پر روشنی ہے کہ اس جنبش گمانیہ کو
 میرے انکس نے کم زرخ بنا رکھا ہے
 دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدت
 تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تیری دوکان کے یہ ذریعہ زیور
 یہ محبوبہ یہ لکھن یہ طسقاٹی پیسے
 یہ زرد و سیم کی اینٹوں سے لہری الماری
 کسی خندہ ادا کا تابوستانِ حرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے برہمتی ہوئی حاجت کیلئے
 کیسے حالات میں کس زرخِ یہاں تک دیے
 کتنے ناداروں نے اظلاس کے پکراؤ میں
 پہلے تو رہی کیے بعد ازاں تک دیے

تیری میزوں کے یہ بے دم شہرے پڑے
 ایک جلاوکی تلوار رہے ہیں اب تک
 گرنے انگھوں کے کشکول ہوس کے متصل
 ہرنے نگوں کے غریب رہے ہیں اب تک

ساتھ کے تیس نہیں تیس کے تیرہ دے دے
 اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا
 آج اک تلخ ضرورت ہے ہرے پیشِ نظر
 میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

منصور

وہ کیا خطا تھی ؟
 کہ جس کی پاؤں میں ابھی تک
 میں قرنا قرنا سے شکارِ عبودیت
 طوق درگلو — پا بہ گلِ رانا ہوں
 وہ جرم کیا تھا ؟
 کہ زندگی بھرتویں
 ترے آستانِ پر سجدوں کی نذر گزرا تھا ہوں
 اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسہ گوانی - غلابِ عالم
 ترکیا مری بے طلبِ ریاضت - مجاہدِ کامی صمد ہے
 بجے گا ہے

خدا نے تیرا وہ آبِ مادہ بجے گا ہے
 مجھے تری بندگی کے سدرے میں کیا بلا ہے؟
 کہاں ہے وہ تیرا دستِ نیاز جس کے جلوہ رخا کے تھے
 منہ سے حرفوں میں ہر مینے کے حاشیے ہیں کے رہ گئے ہیں
 کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں
 بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر آتیں
 کہاں ہیں وہ تیرے شیرِ دشمنہ دشمنوں کے بدلے اُستادِ نبوت
 کہ جن کی کاذب جھک سے ڈسنے
 گرسنہ خلوق کو ازل سے خام رکھا
 کہاں ہیں اُن درجی کھلنوں کے اُونچے بازو کس طرف ہیں
 میں ملان دوایا مت کی حقیقت سے باخبر ہوں
 یہ سب وہ رنگیں خام تھے جن کے بل پہ تو نے

زمین پھنسن و غنادر ظلم و فساد و عرص و عرص کے ایسے
دُشویں اڑائے

کرنیل آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وعدہ لاشریک دُنیا ہزار جہتوں میں کٹ گئی ہے

اگرچہ رو بر راست سے لے کے اب تک
بے شمار صدیوں کے غاصب ہیں
مگر یہ تاریخ کی کسی سال راہبہ جو
ترسے کلیساؤں جگہ دوں اور عرم سراؤں کے مجرمانہ رموز سے
آشنا ہی ہے
ہر اک خولے کی خاک اڑانے کے بعد آئی تو کہہ رہی ہے
"سنو شیبوں کے پاسو!"

یہ جہاں تمہارا ہے
یہ زمیں یہ فلک یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمہارے ہیں
دوسرا ماسوا تمہارے کوئی نہیں ہے

خداوند کی تیغ تقریبی بے حقیقت ہے بے سبب ہے
 اوجہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انسان کا داہمہ تھا
 یہ داہمہ اس قدر بڑھا پھر
 کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
 اور اس خداوند

اس تصور کے آئینے پر
 تمہارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے
 تم کو محکوم و پابزنجیر کر دیا ہے
 یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب پہلا فسوں ہے جس نے
 مزایج انسان کو غاصبانہ شعور بخشا
 اگر یہ سچ ہے !

اگر یہ سچ ہے خدائے خور و آب مادہ
 تو یہ من و تو کی پیٹ و بالا خصل مہل کیوں نہ کر دوں
 کہ ان مراتب کی کشمکش سے ہی

آج میں اور میرے ہم جنس
 اس طرح ایک دوسرے کے غیر ہیں
 جس طرح زمستان کی بر فباری کے بعد گر جان کر سہ
 بھوک کی شقاوت سے تنگ اگر
 اُس ایک لمحے کے منتظر ہوں
 جب ان کا کوئی نچیف سامتی غنودگی کا شکار ہو
 اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر حیرت پھاڑ ڈالیں
 کہ اس شکم کے صیب دوزخ سے بڑھ کے کوئی نہیں جہنم
 نہ اس جہاں میں نہ اُس جہاں میں



غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا بھڑا ہونا
خود گھن سادہم سفر بیزار
اک تم ہے شکستہ پا ہونا
کتنی جاگاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا
نشیہ نہ سیت گناہ کے بعد
سخت مثل ہے پارہا ہونا
آدمی کو حسد اناہ و کھٹے
آدمی کا کہی حسد اہونا
دل کی باتوں پر کون جائے فراز
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا



تیرے ہوتے ہوئے نخل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں شمع کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو لادوں کے بجاتے ہیں چراغ

بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دوبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

یا خبرِ اُج کو کہ دامن میں بھرمک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے پکاتے ہیں چراغ

لو یہ بختہ میں ہم لوگ پر روش ہے غم سیر

خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو

کر و ارض پہ نہ بگتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد جو ہے ہم بھی کہ اب گلشن پر

برق گرتی ہے تو زلعاں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں ہی ہیں کہ مستہ از

رات قورات ہے ہم دلی کو جلاتے ہیں چراغ



میری حالت ہے کہ احساں طلب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی
فتنہ گر دشمنی دو ماں ذرا آہستہ مگر
سائیر زلفت میں آرام طلب ہے کوئی
اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تفریب طلب ہے کوئی
آج تک اُن سے رہ درم چلی جاتی ہے
جی سے کچھ پہلے توقع متی نہاں ہے کوئی
یا تجھے دیکھ کے بھرتائے خوشی سے آنسو
یا مری انگسلائی گزری ہوئی شب ہے کوئی
جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فراز
آئندہ ہے کوئی خندہ طلب ہے کوئی



مہب جو کانٹے ہیں دل میں تفتاؤں کے پھول تھے
تج کے زخم پہلے سشناؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کو مہب بٹوا گلِ فشاں گلِ فشاں
جس طرح پھوٹتے آجے پاؤں کے پھول تھے

مٹی ہیں کو بہت غارِ زارِ جنوں کی لگیں
دوستو! درندہ اقوالِ داناؤں کے پھول تھے

غم کی نوسے دھڑکتے دلوں کے کنول بھگ گئے
دھوپ ہیں کیسے نکلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

برفت زاروں میں کوئی اگر یہ سحساں دیکھتا
جا۔ بجا نقشِ پاکوہ پھیلاؤں کے پھول تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں ترہ گیس
پک سگئے کوڑھیل مول جو گادوں کے پھول تھے

زہر آگیں فضا بستیوں کی جنہیں کھ گئی
ہم فرازہ ایسے سنسان صحراؤں کے پھول تھے



سکوتِ شامِ حسنہاں ہے قریبِ آباد
بڑا دوس سماں ہے قریبِ آباد

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زحیمِ لقا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریبِ آباد

رو طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجرِ ہم سفران ہے قریبِ آباد

جو دشتِ عشق میں پھرے وہ مگر بحرِ نہ سٹے
یہاں دُکھوں ہی دُکھوں ہے قریبِ آباد

یہ آمدیاں ہیں تو شہرِ دہلی کی خیر نہیں
زمانہ خاکِ فشاں ہے قریب آباد

فقیہہ شہر کی مجلس نہیں کہ دور رہو
یہ بنم پھر معشاں ہے قریب آباد

فرازِ دور کے سورج غروب بجے گئے
یہ دورِ کم نظیراں ہے قریب آباد

جانشین

(عشق و زندگی میں ہمارے ہر غامض سے منہ نہ کر کھنٹی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا
جاہلو!

تم اندھیروں کی دنیا کے پاسی
بہالت کے تاریک غاروں کے فروغ
کہاں جا رہے ہو، کہاں؟
تم تھی دست ہو
تم تھی جیب ہو
تم تھی دامنوں سے بھی کوئی لالچ نہیں

تم نہیں جانتے
 تم نہیں مانتے
 ہم تمہارے لیے
 لب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو
 منڈیوں میں بجائے ہوئے ہیں
 تم نہیں دیکھتے
 تم کہ شب کو رُحو
 ہم نے دن کے آجائے میں بھی۔ بس تمہارے لیے
 اِس تمدن کے فانوس روشن کیے
 جن کی شفاف کرفوں سے سارا جہاں بقعہ نور ہے
 عالم طور ہے
 پاگلو!

تم نہیں جانتے
 تم نہیں مانتے
 ہم ارسطو ہیں شاہوں کے اُستاد ہیں

ہم غلطوں میں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گریا دیں

ہم ہی سقراط ہیں

ہم ہی بقراط ہیں

ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے فرومند فرزند ہیں

ہم ہی کون و مکان کے خداوند ہیں

سر پھر د!

تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمہیں

خاک و غول کے سمندریں نہلا دیا

صرف اپنے تسلط کی خاطر تمہیں

ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹھا دیا

چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے

اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا

تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں

یہ تسلط یہ جاہ و حشم یہ زین

بس تمہارے لیے ہے تمہارے لیے

دورِ فردا کے فرما زو، ہوتھیں
 تم کو ہونا ہے ابداد کا جانشین
 پاگلو! ہم سے عالی نظر دیدہ ور
 تم سے جو بھی کہیں مان لو
 تم نہیں جانتے تم کہ مردہ رہے سالہا سال سے
 بھیڑیوں اور درندوں کی ارواح بد تم میں در آئی ہیں
 اور جمل وجہوں کی نجس شیطیں دے کے تم کو
 بغاوت پہ اکساتی ہیں
 اپنے ابداد سے، اپنے فرما زوؤں سے، آقاؤں سے
 جاہلو!
 پاگلو!!